

علت مرض — اور اس کا علاج

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي السَّبْرِ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ
أَيْدِي النَّاسِ (۱۳۰)

انسانوں کے خود ساختہ نظام زندگی کا نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں تباہیاں مچ رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز آج سے قریب چھ ہزار سال پہلے ہوا۔ اربابِ علم و تحقیق، انسانی تاریخ کے اس چھ ہزار سالہ دور کے منتقد جو کچھ کھوج لگا سکے ہیں، اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ اس کی تاریخ، خوں ریز یوں اور فساد انگیز یوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ لیکن جس انداز کی تباہی موجودہ زمانے میں رونما ہوئی ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پہلے جو تباہیاں آتے تھیں، ایک تو وہ کسی خاص خطہ زمین تک محدود ہوتی تھیں، اور دوسرے ان کے نتائج و عواقب اتنے دور رس نہیں ہوتے تھے۔ عصر حاضر میں، وسائل و وسائل کی وسعت و کثرت کا نتیجہ ہے کہ جو آگ کسی ایک خطہ زمین میں بجھتی ہے، اس کے شعلے (اثر) پابلا واسطہ، پورے کے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اور اب تو شاید یہ شعلے ابھر کر اجرامِ فلکی تک کو بھی محیط ہو جایا کریں گے۔ دوسری طرف، ان شعلہ خیز یوں اور شرابیوں کے انجام و عواقب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتے، یہ آنے والی نسلوں تک مسلسل پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مکان فراموش اور زمان نا آستانہ تباہیاں جن کا نقشہ قرآن کریم نے اس آیتہ جلیلہ کے چار الفاظ میں نہایت جامعیت سے کھینچ کر رکھ دیا ہے جو زیرِ عنوان ہے۔

جو اربابِ علم و بصیرت، انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں، وہ اس صورتِ حال سے انتہائی دل گرفتہ اور آہ بلب رہتے ہیں اور ان تباہیوں کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے مصروفِ تحقیق و تدقیق۔ لیکن ان کی اس تمام سعی و کاوش کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آج جس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اور اس کا علاج اس طرح سے کرتے ہیں گویا انہوں نے اس فرد میں گم گشتہ کا سراغ پا لیا ہے جس کی تلاش میں، جنت سے نکالاجہ، ابنِ آدم، مادہ سے مارے پھر رہا ہے۔ لیکن ہنوز اس جشی مسرّت کی شب چراغاں کی سحر بھی نہیں چوٹ پائی کہ اس تشخیص و تدبیر کے نتائج اس کی ناکامی کے قائم گسارہ بن جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ وہ سیاسی

نظام ہے جس سے قوموں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے اور باہمی آویزشوں کا موجب بنتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث وہ معاشی نظام ہے جس سے طبقات وجود میں آتے ہیں اور طبقاتی نزاع ان کے باہمی تضادات کا موجب بنتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی وجہ حکومتوں کی انتظامی مشینری کی کمزوری ہے جس سے لانا لوٹیت کی روک تھام نہیں ہوتی اور کوئی اسے نظام تعلیم و تربیت کی خرابی پر محمول کرتا ہے جس سے نوجوانوں میں جنسی ہر نہادیاں اور سرکشی و قانون شکنی کے رجحانات عام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سطحی نگاہ سے دیکھئے تو یہ اسباب موجودہ لے لاہروی اور عالمگیر تباہیوں کے بڑے مؤثر عوامل دکھائی دیں گے۔ لیکن سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھئے تو یہ اسباب صرف علامات مرض ثابت ہوں گے، علت مرض نہیں۔ اور علت مرض تک یہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

قرآن کریم، علامات مرض سے بحث نہیں کرتا، وہ علت مرض کی نشاندہی کرتا ہے جب کہتا ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ** (۱۱۸) یعنی قوموں کی زندگی کی عمارت اس کے نظریۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جو اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جس قسم کا نظریۂ حیات اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی اور جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اسی قسم کے خارجی نتائج۔ اسباب و علل کی ان کڑیوں کی رو سے غلط نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتا ہے اور صحیح نظریۂ حیات کے فطری برگ و بار کی سر فرازیاں اور خوش گواریاں۔ قرآن کریم کی اس تشخیص کی رو سے، عصر حاضر کی تباہیوں کی بنیادی اور اساسی وجہ وہ نظریۂ حیات ہے جس نے اس وقت عالم گیر حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔

یہ نظریۂ حیات کیا ہے؟ یہ کہ انسانی زندگی دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ انسان، طبیعی قوانین کے مطابق، حیوانات کی طرح، کھاتا، پیتا، افزائش نسل کرتا اور اس کے بعد مرجھاتا ہے۔ اور جب وہ مرجھاتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں **وَالسَّيِّئِينَ كَفَرُوا وَيَسْتَفْعُونَ رَبَّهُمْ لَئِنْ كُنَّا نَكُلُّ إِلَّا نَعَامٌ** (۱۱۷) یہ لوگ، جو حیوانی زندگی سے بلند زندگی کے قائل نہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور بالآخر مرجھاتے ہیں) دوسری جگہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **أَوَلَيْسَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّ هُمْ أَتْلُ** (۱۱۷) یہ لوگ حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی سگئے گزرے۔ یہ **بَلَّ هُمْ أَتْلُ**۔ ایک گہری حقیقت کا ترجمان ہے۔ حیوانات پر فطرت نے خود پابندی عائد کر رکھی ہے۔ جنہیں ان کی جبلت کہا جاتا۔ اور حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا لہذا ان پابندیوں کو توڑ سکیں۔ لیکن انسان پر فطرت نے کوئی کنٹرول نہیں رکھا۔ دوسری طرف اس کی قوتیں بھی لانتہا ہیں۔ اب آپ کسی ایسے حیوان کا تصور ذہن میں لائیے جسے لامحدود قوتیں حاصل ہوں اور ان قوتوں کو وہ جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ اس پر اس باب میں فطرت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ نیز، وہ حیوان کسی جنگل میں اکیلے نہ ہو۔ اس قسم کے بہت سے۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں حیوان ہوں اور ان سب نے اکٹھے رہنا ہو۔ اس کے بعد سوچئے کہ اس کا نتیجہ خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا!

انسانی قوت کے استعمال پر پابندیاں، سوسائٹی کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور سوسائٹی خود انہی افراد کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ اسے بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان خود مل بیٹھ کر طے کرتے ہیں کہ ہمیں پرکشی قسم کی پابندیوں کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے، کہ یہ انسان ان پابندیوں کو ملحوظ رکھیں۔ یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ ان میں سے جو شخص ان پابندیوں کو توڑے گا، اسے یہ سزا ملے گی۔ اسے سوسائٹی کا قانون عدل کہا جاتا ہے۔ اس قانون عدل کو بروئے کار لانے کے لئے سوسائٹی ایک مشینری وضع کرتی ہے جسے انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کہا جاتا ہے۔ اس انتظامیہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ معاشرہ کے ایک ایک فرد کے سر پر ایک ایک نگران مقرر کرے جو ہمیشہ دیکھتا رہے کہ وہ ان قوانین کی پابندی کرتا ہے یا نہیں۔ یہ اس انتظام کا پہلا نقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قانون شکنی انتظامیہ کی نگاہوں سے اوجھل رہے، اس پر کسی قسم کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ عقل حیلہ گرا انسان کو سینکڑوں ایسی تدابیر سمجھا دیتی ہے جن سے اس کی قانون شکنی کسی کی گرفت میں نہ آ سکے۔

اس انتظام کا دوسرا نقص یہ ہے کہ خود انتظامیہ کی مشینری بھی انتہی جیسے انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو اپنے مفاد کی خاطر، قانون شکنی سے کساح برتنے یا ان سے تعاون کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون شکنی عام ہو جاتی ہے۔ اتنی عام کہ اس کی روک تھام سوسائٹی کے بس میں نہیں رہتی اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ خود اس قانون ہی کو منسوخ قرار دے دے۔ سوسائٹی کی اس بے بسی سے قانون کا احترام ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ تو رہی پابندیوں کی عدم پابندی۔ جہاں تک حسن اخلاق کا تعلق ہے، اس نظریہ زندگی کی روش سے، اس کے لئے کوئی جذبہ محرکہ ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً قانون کی روش سے آپ لوگوں کو اس کے تو پابند کر سکتے ہیں کہ وہ کسی کے دل چوری نہ کریں۔ لیکن دنیا کا کوئی قانون انہیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی محتاج کی امداد کریں۔ اس کا تعلق حسن اخلاق سے ہے۔ اور طبیعی نظریہ زندگی کی روش سے، کوئی شخص اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ میں کسی محتاج کی مدد کیوں کروں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تم محتاج کی مدد اس لئے کرو کہ اگر کل کو تم محتاج ہو جاؤ، تو دوسرا تمہاری مدد کرے۔ لیکن یہ جواب جس قدر بوجہ اور جذبہ جس قدر کمزور ہے، وہ ظاہر ہے۔ اگر ایک شخص اس کا انتظام کر لے کہ اسے کسی کی امداد کی ضرورت ہی نہ پڑے تو اس کے لئے یہ دلیل بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ دراصل، یہ دلیل حسن سلوک کے لئے جذبہ محرکہ نہیں بلکہ کاروباری فہمیت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ یعنی میں کسی کو کچھ دوں تاکہ کل کو عند الضرورت وہ مجھے کچھ دے۔ یہ خالصہ بزنس ہے۔ یہ تو بہا ایک قوم کے اندر افراد کا باہمی معاملہ۔ جہاں تک اقوام کا باہمی معاملہ ہے حیوانی نظریہ زندگی کی روش سے، کوئی حوالہ ایسے مؤثر نہیں ہو سکتے جو کسی بالادست قوم کو کمزور قوم پر دست درازی کرنے سے روک سکے۔ اقوام عالم نے بین الاقوامی امور کے تصفیہ کے لئے پہلے لیگ آف نیشنز کی طرح ڈالی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد اب اقوام متحدہ کی تشکیل کر رکھی ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ وہاں بھی بالادست قوتوں کی مداخلت ہے۔ زیر دستوں کی کچھ شوائی نہیں ہوتی۔ اور یہ کوئی عجیب انجیز بات نہیں۔ حیوانی نظریہ زندگی میں ”جنگل کے قانون“ سے برتر کوئی قانون ہو نہیں سکتا۔ اور جنگل کا قانون یہی ہے کہ ہر نویر دست، بالادست کا شکار ہوتا ہے۔

اب آپ نے غور فرمایا کہ اس وقت عالم گیر تباہیوں نے جس بُری طرح سے نوع انسان کو گھیر رکھا ہے، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ ہے حیوانی نظریہ زندگی۔ اسی کو مادی نظریہ حیات یا (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ یہ نظریہ یوں تو قدیم ایام سے چلا آرہا تھا، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں اس نے یورپ میں نمایاں شہرت حاصل کی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو مذہب پرست طبقہ، زبانی اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہے، عملاً وہ بھی اسی کا پیرو ہے۔ ان کی وجہ اختصار چند مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اکبر کے الفاظ میں یہ شیخ صاحب دہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں یہ الگ بات ہے، ہم ان کا ادب کرتے ہیں

(۰)

اس کے برعکس، قرآن کریم انسانی زندگی کا ایک اور نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ وہ نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے تابع۔ اور نہ ہی انسان کی طبیعی زندگی کے ختم ہو جانے کے ساتھ (جسے موت کہا جاتا ہے) اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما یا اضمحلال و انحطاط، طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن ذات کی نشوونما یا ضعف و انحطاط، مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً انسان اگر اچھی غذا کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی عمدہ پرورش ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ غذا، نا جائز دولت سے حاصل کردہ ہوتی ہے تو اس سے اس کی ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس کا جو عمل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اس کے خلاف ہوتا ہے، اس سے اس کی ذات میں ضعف اور انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال کے اثرات اس کی ذات پر از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خارجی مشینری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تصویحات بالا سے واضح ہے کہ انسانی اعمال اور ان کے اثرات کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ ایسے اعمال جن کا اثر طبیعی ہوتا ہے، اور وہ محدود ہوتا ہے فرد متعلقہ کے جسم تک۔ مثلاً ایک شخص انیون کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اپنی طبیعی قوانین متضمن اور افسردہ ہو جائیں گی۔ کسی دوسرے پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

۲۔ ایسے اعمال جن کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص چوری کرتا ہے۔ اس کے اس عمل کا اثر معاشرہ کے دیگر افراد پر پڑتا ہے۔ اس کی دکان تمام کے لئے معاشرہ قوانین مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایسے اعمال کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ چونکہ چوری کرنا (یا دوسروں کا مال باطل طریق سے حاصل کرنا) ایک مستقل قدر کی خلاف ورزی بھی ہے، اس لئے اس کا اثر انسان کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِذَا هُوَ نَجَسٌ

اور پڑھ کر بھی نہیں سنا۔ اِقْرَأْ كِتَابَكَ (۱۱۱) وہ اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھتا ہے۔ وَكَفَىٰ يٰٓمُؤْمِنِيْنَكَ
الْبَعْدَ مَا عَقِبْتُمْ حَقِيْبًا۔ (۱۱۲) اور پھر اپنی جزا اور سزا کا حساب بھی خود ہی کرتا ہے۔

(۱)

جس طرح افراد کے معاملہ میں مستقل اقدار کی خلاف ورزی، گرفت اور سزا کا موجب بنتی ہے۔ اسی طرح
اقوام کی صورت میں بھی، ان اقدار سے سرکشی کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اقوام بھی افراد ہی کا
مجموعہ ہوتی ہیں۔ مستقل اقدار کی خلاف ورزی سے افراد کی ذات نشئت و انضام لال کا شکار ہو جاتی ہے
اور اس قسم کے افراد پر مشتمل قوم، اجتماعی طور پر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے، بے شمار
مقامات پر، اقوام سابقہ کے جرائم اور ان کی وجہ سے ان کی تباہی اور بربادی کا غیرت آواز تذکرہ کیا ہے۔
ان اقوام کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد حضور نبی اکرم کے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا گیا۔
وَلَقَدْ مَكَنَّا لَهُمْ دِيْنًا اِنْ مَكَنْتُمْ فِيْهِ۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا
وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً۔ فَمَا اَعْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ وَلَا
اَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْعَلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ
بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَعْجِلُوْنَ۔ (۲۲۲)

ان اقوام کو ہم نے ملک میں اس قدر قوت اور ممکن عطا کر رکھا تھا کہ ایسی قوت اور
ممکن تمہیں بھی نصیب نہیں۔ انہیں دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں حاصل
تھیں۔ لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کی یہ
صلاحیتیں بے کار ہو کر رہ گئیں اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں
چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ان قوموں کے جرائم کی جو تفصیل قرآن کریم نے دی ہے، وہ طول طویل ہے۔ لیکن ملخص ان کا یہ ہے کہ قِیَادًا
بَطْشُكُمْ بَطْشُكُمْ تَحْتَ اَیْدِیْنِ۔ (۲۲۳) وہ کمزوروں اور زبردستوں کو ظلم و استبداد کے آہنی
شکنجہ میں اس شدت سے جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی پڑیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ جہانک فرد اور
معاشرہ کا تعلق ہے، ناقص ہی سہی، لیکن پھر بھی ایک معاشرتی نظام عدل ایسا ہوتا ہے جو فرد کو
اندکاب جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن قوموں کی صورت میں اس قسم کا کوئی نظام نہیں
ہوتا جو بالادست قوم کو کمزور اقوام پر ظلم اور زیادتی سے روکے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے)
قوموں کے نزدیک ”جنگل کا قانون“ ہی ہیج زندگی ہوتا ہے۔ یعنی اس میں ہر طاقتور کو حق حاصل
ہوتا ہے کہ کمزور کو چبا ڈالے۔ اس کے برعکس، جب کوئی ایسی قوم برسرِ اقتدار آئے جو حیات
آخرت پر ایمان رکھتی ہو تو اس کا فریضہ زندگی، بلکہ ان کے اقتدار کی وجہ جواز، یہ ہوتی ہے کہ
وہ مظلوموں کی حفاظت اور کمزوروں کی مدافعت کرے۔ وہ لوگ دنیا میں عدل کے محافظ اور انصاف
کے پاس بان بن کر جیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، عدل کی حدود کہاں تک پھیلتی ہیں، اس کا اندازہ

اس ایک اصول سے لگا بیٹھے جس پر وہ عمل پیرا ہوتے ہیں کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰتُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَا تَقْتُلُوْا — اَعْدَاؤُكُمْ..... (سپ) دیکھنا کسی قوم کو دشمنی نہیں اس پر آمادہ نہ کرو گے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا کہ مظلوم کی فریاد کہیں سے آئے، فوراً اس کی امداد کے لئے پہنچو۔ اسے ظالم کی گرفت سے بچاؤ خواہ اس میں تمہیں اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ (۵/۳) دنیا کے ہر انسان — بلا تفریق، رنگ، نسل، زبان، وطن، مذہب و ملت — کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، معاہدہ کی حفاظت کرو، کہ تمہیں صاحب اقتدار اسی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس قوم کے سامنے، مسلح و ہتھکا اصول یہ ہوتا ہے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَكُنْ فِيْ اَلْمَرْحِلِ (سپ)

وہی قوم، وہی نظام، وہی نظریہ زندگی باقی رہ سکتا ہے جس کے پیش نظر کسی خاص قوم، خاص قبیلہ، خاص ملک کا مفاد نہیں بلکہ پوری کی پوری نوع انسان کی منفعت ہو۔ وہ اس اصول پر عمل پیرا ہونے سے بقا اور حیاتِ دوام حاصل کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ مغرب کا مادی نظریہ حیات اور قرآن کا حیاتِ آخرت کا نظریہ کس طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کے عملی نتائج کس طرح باہمسد گرد مخالفت! آج ساری دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے، وہ مادی نظریہ حیات کا فطری نتیجہ اور اس کے شجرۃ النورم کا لازمی برگ و بار ہے۔ جب تک انسان اس نظریہ حیات کا قائل رہے گا، اس جہنم کی آگ زیادہ سے زیادہ شعلہ خیز ہوتی جائے گی۔ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریہ حیات کو بدل جائے اور اس کی جگہ ایمان بالا آخرت کو انسانی قلب کی گہرائیوں میں ماسخ کیا جائے۔

لیکن، دوسروں کا ذکر کیا، یہ ایمان تو آج خود ہمارے دل کی گہرائیوں میں بھی راسخ نہیں، جو اس ایمان کے دعویٰ کی بنیاد اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہم آخرت پر ایمان کے محض الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ اس ایمان کی کوئی حقیقت سی جھلک بھی ہماری عمل زندگی میں نظر نہیں آتی۔ قرآنی نظریہ حیات کو عملی زندگی کی اساس بنانے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس فطری حیات کو ظہار کے نصاب تعلیم کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے۔ اور اس طرح یہ ان کے تصورات و معتقدات کی رگوں میں نوحی زندگی ہی کر دوڑے۔ اسی میں ہماری زندگی کا راز ہے اور اسی سے انسانیت کی فوز و فلاح وابستہ!

(۵)

ضرورتِ رشتہ پنجاب سے متعلق، ۳۰ سالہ، والدین کے تنہا فرزند ارجمند، حوامی لے (اردو ادب) میں اور انگریز میں اچھے نمبر پر فائز، کے لئے برطانوی شہریت کی حامل اور مشرقی ماحول کی پروردہ، خوش گل و شیریں و فیاض حیات، مغرب لے جس کے لئے سوائے اس کے کہ وہ اور اس کے والدین ذات پات و فاندانی حیثیت اور دیگر مسافرانہ رسوم کی بندش سے متبرا ہوں اور کوئی قید نہیں۔ (ذیل کتابت امید، لاہور) ف۔ مروت ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/۶/۶۷ - لاہور